سرسید کا مقام: حالی و شبلی کی اردو شاعری کی روشنی میں

نبیل مشتاق
لیکچرار اردو
گورنمنٹ ڈگری کالج کاہنہ نو، لاہور

STATUS OF SIR SYED
IN LIGHT OF THE VERSE OF HALI AND SHIBLI

Nabeel Mushtaq
Lecturer in Urdu
Govt. Degree College Kahna Nau, Lahore

Abstract

Sir Syed Ahmed Khan is known as a Muslim reformer of the 19th century. He played an important role in introducing modern Urdu verse and prose. He himself was a prominent author, editor and compiler. Altaf Husain Hali is a well known poet, prose writer and critic etc. Shibli Naumani is another great name of Urdu literature. Shibli was a distinguished scholar, writer and poet. Hali and Shibli were close companions of Sir Syed. They discussed the personality and achievements of Sir Syed in their verses. The article analyses the status of Sir Syed in the light of the verse of the said two great names of Urdu.

Keywords:

سرسید، حالی، شبلی، نواب مصطفیٰ خاں، ڈپٹی نذیر احمد، الیاس اعظمی، دہلی، علی گڑھ، حیات سعدی، ہندوستان، تنقید، کانگرس، کلیات شبلی

حالی وشبلی کی سرسید احمد خاں سے ملاقات دونوں کی علمی وادبی زندگی میں ایک اہم موڑ اور سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔حالی وشبلی کا شمار سرسید کے رفقا میں کیا جاتا ہے ۔سرسید وحالی کی پہلی ملاقات ۱۸۶۷ء میں ہوئی تھی ۔ان دنوں حالی ،نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے صاحبزادے نواب نقش بند خاں کے اتالیق مقرر تھے ۔وہ نواب شیفتہ کے ہمراہ اکثر دہلی آتے رہتے تھے ۔ایک دفعہ نواب شیفتہ دہلی گئے تو سرسید سے ملاقات کے لیے بھی تشریف لے گئے تھے ۔اس مرتبہ حالی بھی ان کے ہمراہ تھے ۔اس طرح سرسید وحالی کی پہلی ملاقات ممکن ہوئی تھی ۔سرسید وحالی کی یہ ملاقات علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کی ایک مجلس میں ہوئی تھی ۔سرسید وحالی کی اس پہلی ملاقات سے متعلق افضل حق قرشی لکھتے ہیں:

''۱۸۶۷ء

شیفتہ نے سرسید سے تعارف کرایا۔''(۱)

اس ملاقات کے بعد سرسید وحالی کی ملاقاتوں کا سلسلہ سرسید کی زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔ حالی کے برعکس شبلی کی پہلی ملاقات سرسید سے اس وقت ہوئی تھی جب وہ ۱۸۸۱ء میں اپنے والد محترم شیخ حبیب اللہ کے ہمراہ دارالعلوم علی گڑھ میں زیرِ تعلیم اپنے چھوٹے بھائی مہدی حسن سے ملنے تشریف لے گئے تھے ۔اس زمانے میں مہدی حسن دارالعلوم علی گڑھ میں انٹرنس کے طالب علم تھے ۔شبلی اس ملاقات کے موقع پر سرسید کی مدح میں ایک عربی قصیدہ بھی لکھ کر لے گئے تھے ۔اس قصیدہ کے ذریعے شبلی نے سرسید کی علمی وادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا ۔سید سلیمان ندوی نے اس ملاقات کی روداد کچھ یوں لکھی ہے:

> ''اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شیخ صاحب مولانا کو لے کر مہدی حسن مرحوم سے ملنے کے لئے علی گڈھ تشریف لے گئے ،منادیٔ غیب نے آواز دی' آمد آں یارے کہ ما می خواستیم ''۔ مولانا گئے تو خالی ہاتھ نہیں گئے ،سرسید کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ لے کر ساتھ گئے، سرسید نے اس قصیدہ کو دیکھا تو اُس کے تیور ،زبان ،اور طرز ادا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، اور قصیدہ کو اپنے اخبار علی گڈھ گزٹ (مورخہ ۱۵/ اکتوبر ۱۸۸۱ء) میں چھپوادیا۔''(۲)

سرسید نے شبلی کے اس قصیدہ کی زبان ،طرز ادا اور مضمون کی بہت تعریف کی تھی ۔وہ شبلی کی عربی دانی سے بھی بہت متاثر ہوئے تھے ۔سرسید نے یہ قصیدہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مورخہ ۱۵/ اکتوبر ۱۸۸۱ء کے شمارہ میں شائع بھی کروادیا تھا ۔سرسید سے شبلی کی یہ پہلی ملاقات بہت مفید رہی تھی جس کا فائدہ شبلی کو ۱۸۸۲ء میں اس وقت ہوا تھا جب دارالعلوم علی گڑھ میں مشرقی زبانوں کے معلم کی آسامی خالی ہوئی اور اس خالی آسامی کو پُر کرنے کے لیے درخواستیں مانگی گئی تھیں ۔شبلی نے بھی اس خالی آسامی کے لیے درخواست دی تھی ۔سرسید ،شبلی کے مشرقی زبانوں پر عبور کے حوالے سے پہلے سے ہی واقف تھے ۔چناں چہ شبلی کا ہی انتخاب کیا گیا ۔اس کے

بعد سرسید وشبلی کا ساتھ ۱۸۹۸ء تک قائم رہا۔شبلی،سرسید کی وفات ۱۸۹۸ء کے بعد دارالعلوم علی گڑھ سے مستعفی ہو گئے تھے۔اس کا سبب سید محمود سے ان کے اختلافات تھے۔

سرسید وحالی کی رفاقت کم وبیش ۳۱/برس (۱۸۶۷ء تا ۱۸۹۸ء) تک رہی۔جب کہ سرسید وشبلی کا ساتھ بھی تقریباً ۱۶/برس (۱۸۸۲ء تا ۱۸۹۸ء) رہا تھا۔ان حقائق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حالی وشبلی میں سے حالی کی سرسید سے وابستگی شبلی کے مقابلے میں زیادہ عرصہ رہی تھی۔حالی وشبلی نے علمی،ادبی،تعلیمی اور مذہبی میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے،ان میں سرسید کی صحبت کا بھی بہت بڑا عمل دخل تھا۔حالی وشبلی نے سرسید کی صحبت ہی میں قدیم شاعری اور نثر نگاری کو چھوڑ کر جدید شاعری اور نثر نگاری کا آغاز کیا۔حالی نے سرسید کے ایما پر ہی اپنی مشہور طویل نظم ''مسدس مدوجزر اسلام'' اور شبلی نے ''مثنوی صبح امید'' لکھی۔حالی کی ''مسدس مدوجزر اسلام'' اور شبلی کی ''مثنوی صبح امید'' جیسی نظمیں جدید شاعری کا نکتۂ آغاز تسلیم کی جاتی ہیں۔حالی وشبلی کی یہ دونوں طویل نظمیں نہ صرف جدید اردو شاعری کا نکتۂ آغاز تھیں بلکہ حالی وشبلی کے علمی،ادبی،تعلیمی، سماجی،سیاسی اور مذہبی خیالات میں تبدیلی کا نقشِ اول بھی تھیں۔حالی نے اس بات کا اعتراف خود بھی کیا ہے کہ انھوں نے ''مسدس مدوجزر اسلام'' سرسید کی ترغیب پر لکھی تھی۔حالی نے یہ اعتراف اپنی آپ بیتی ترجمۂ حالی میں کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی وتنزلی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔چنانچہ میں نے اول مسدس مدوجزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ کر بارہا رشائع ہو چکی ہیں،لکھیں۔''(۳)

حالی ''مسدس مدوجزر اسلام'' کی تخلیق سے پہلے زیادہ تر روایتی شاعری کے چکر ہی میں پڑے ہوئے تھے۔وہ زیادہ تر غزلیں ہی تخلیق کر رہے تھے۔ان غزلوں میں روایتی عشقیہ مضامین رچے بسے دکھائی دیتے تھے۔ حالی نے ''مسدس مدوجزر اسلام'' کی تخلیق سے پہلے ۱۸۷۴ء کے آس پاس کے زمانے میں دو چار نظمیں انجمن پنجاب کے مشاعروں میں بھی پڑھی تھیں۔ان نظموں میں ''برکھارت''،''نشاط اُمید''،''حب وطن'' اور ''مناظرۂ رحم وانصاف''،جیسی نظمیں شامل ہیں۔شبلی بھی حالی کی طرح ''مثنوی صبحِ امید'' کی تخلیق سے پہلے روایتی غزل گوئی میں مصروف تھے۔شبلی اس زمانے میں زیادہ تر فارسی زبان میں شعر کہتے تھے اور انھیں فارسی غزل گوئی میں خاص مقام حاصل تھا۔شبلی نے ۱۸۸۲ء میں دارالعلوم علی گڑھ سے وابستگی کے بعد بہت حد تک روایتی شاعری سے اپنا فاصلہ قائم کر لیا تھا۔وہ جدید موضوعات اور رجحانات سے بھرپور شاعری کرنے لگے تھے جس شاعری کا نکتۂ آغاز ''مثنوی صبحِ امید'' ہی کو تصور کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی،شبلی کی شاعری کے اس پہلو پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''علی گڑھ سے پہلے مولانا کی شاعری حسن وعشق پر مشتمل تھی مگر علی گڑھ میں مولانا کے موضوع شعر میں تبدیلی آئی اور ان کے ترانے قوم وملت کے غم سے لبریز ہونے لگے۔اب مسلمانوں

کا عروج و زوال ان کی نظموں کا موضوع ہوگیا۔علی گڑھ میں مولانا کی جو چیز سب سے پہلے سامنے آئی وہ مولانا کے فارسی قصائد تھے۔اس کے بعد مثنوی صبح امید لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان اور علی گڑھ تحریک کا خوش آئند مرقع پیش کیا ہے اور علی گڑھ تحریک کو صبح امید سے تعبیر کیا ہے۔مثنوی بار بار چھپی اور مقبول عام ہوئی۔''(۴)

شبلی نے اپنی اس طویل نظم ''مثنوی صبحِ امید'' میں سرسید اور دارالعلوم علی گڑھ کو ہندوستان میں مسلمان قوم کے لیے صبحِ امید سے تعبیر کیا تھا۔شبلی کی اس نظم ''مثنوی صبحِ امید'' کو سرسید کے فیضانِ صحبت کا اثر سمجھا جاتا ہے۔ان کی نظم ''مثنوی صبحِ امید'' اور حالی کی نظم ''مسدس مدوجزر اسلام'' کم وبیش ایک جیسے موضوعات کا ہی احاطہ کرتی ہیں۔حالی وشبلی دونوں نے ان نظموں میں اپنے اپنے انداز سے مسلمان قوم کے تابناک ماضی کو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ قرار دیا ہے۔حالی کی نظم ''مسدس مدوجزر اسلام'' پر مایوسی، اداسی اور نا امیدی کے بادل شبلی کی نظم ''مثنوی صبحِ امید'' کی نسبت زیادہ گہرے ہیں۔حالی نے ''مسدس مدوجزر اسلام'' کے ضمیمہ میں مایوسی اور یاسیت کی اس کیفیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ضمیمہ کے اشعار میں امید اور رجائیت سے بھرپور جذبات کی زیادہ عکاسی ملتی ہے۔حالی وشبلی کو اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے یہ دونوں نظمیں ہی کافی ہیں۔

حالی وشبلی نے جدید شاعری کے ساتھ ساتھ جدید نثر نگاری کا آغاز بھی سرسید کے زیر سایہ ہی کیا تھا۔ حالی وشبلی نے اردو نظم ونثر میں جدید اصناف، اسالیب، رجحانات اور موضوعات کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔اس سلسلے کی ابتدائی کڑیاں حالی کی نظم ''مسدس مدوجزر اسلام'' اور تصنیف ''حیات سعدی'' اور شبلی کی نظم ''مثنوی صبحِ امید'' اور تصنیف ''المامون'' تھیں۔حالی وشبلی نے اپنی کئی تصنیفات کی رجسٹریاں دارالعلوم علی گڑھ کے نام کی تھیں جو ان کی طرف سے سرسید کے احسانات کا اعتراف تھا۔حالی وشبلی کے دل ودماغ میں اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ سرسید اور دارالعلوم علی گڑھ مسلمان قوم کے لیے بہت بڑی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اس زمانے میں سرسید اور دارالعلوم علی گڑھ سے قربت رکھنے والوں میں حالی وشبلی ہی شامل نہیں تھے بلکہ اور بھی بہت سے صاحبِ فکر اور صاحبِ کمال اہل قلم شامل تھے جن کی خدمات اردو ادب اور دارالعلوم علی گڑھ دونوں کے حوالے سے یادگار ہیں۔ان اشخاص کی علمی وادبی تربیت میں سرسید کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔اس بابت عبداللطیف اعظمی لکھتے ہیں:

''سرسید کا ان سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صاحب فکر اہل قلم کی ایک منتخب جماعت اپنے گرد جمع کرلی تھی اور ان میں بھی اپنا ہی جیسا جوش وخروش پیدا کردیا تھا۔اس سے زبان وادب کو اتنا فائدہ پہنچا کہ اگر خود ادب اور تنقید کی سینکڑوں کتابوں کے مصنف ہوتے تو بھی اتنا فائدہ شاید نہ پہنچا سکتے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید نے اس جماعت کے ذریعے اردو کو حیات جاوید بخشی۔اس جماعت کے نمایاں اور ممتاز افراد نواب محسن الملک، نواب وقار الملک،

مولوی چراغ علی،مولوی ذکاءاللہ،خواجہ الطاف حسین حالؔی،مولانا شبلی نعمانی،مولانا نذیر احمداور مولوی زین العابدین ہیں۔"(۵)

ان تمام اہل فکرونظر اور صاحب کمال اشخاص نے اردو نظم ونثر کو کلاسیکی دور کی قدامت پرستی کے گہرے اثرات سے نکال کر جدت پسندی کی دنیا میں داخل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ان صاحب کمال لوگوں کی اکثریت نے جدت پرستی کے رجحانات کا ایک بڑا حصہ سرسید کے خیالات اورنظریات سے اخذ کیا تھا جب کہ حالی وشبلی ان سب اشخاص میں فضیلت کے درجے پر فائز نظر آتے ہیں۔شبلی، دارالعلوم علی گڑھ میں ۱۶/برس تک معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے جب کہ حالی، دارالعلوم علی گڑھ میں معلم کی حیثیت سے تو کبھی بھی نہیں رہے تھے،البتہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن اور دارالعلوم علی گڑھ کے ٹرسٹی کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، جب کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ذیلی تنظیم انجمن ترقی اردو کے لیے بھی حالی وشبلی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔حالی انجمن ترقی اردو کے صدور میں شامل رہے تھے اورشبلی نے اس انجمن میں سیکرٹری کے طور پر فرائض کی انجام دہی کی تھی۔دارالعلوم علی گڑھ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اورانجمن ترقی اردو جیسے اداروں کے قیام میں کلیدی کردار تھا اوران اداروں کو ترقی دینے میں حالی وشبلی نے سرسید کا خوب ساتھ دیا تھا۔یہ ہی سبب تھا کہ سرسید سے حالی وشبلی کا تعلق دوسرے تمام احباب اور رفقا کی نسبت کہیں زیادہ گہرا اور جاندار تھا۔سرسید، حالی اورشبلی کے مابین میل جول اور تعلق کا یہ سلسلہ سرسید کی وفات ۱۸۹۸ء تک کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا۔

اس طویل میل جول اور تعلق کے زمانے میں حالی وشبلی کی نظر میں سرسید کا مقام کیا تھا؟ اس سوال کا جواب کافی حد تک حالی وشبلی کی نظم ونثر کی روشنی میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔حالی وشبلی نے اپنی متفرق نظم ونثر میں اپنے اپنے انداز سے سرسید کی شخصیت، حیات اورکارناموں کا تعارف پیش کیا ہے۔اگر صرف حالی وشبلی کی اردو شاعری ہی کی بات کی جائے تو اس اردو شاعری میں سرسید کی شخصیت، خدمات اورکارناموں سے متعلق کافی معلومات ملتی ہیں۔ان معلومات کی روشنی میں اس بات کا بخوبی تعین کیا جا سکتا ہے کہ حالی وشبلی کی نظر میں سرسید کا مقام ومرتبہ کیا تھا۔

حالی کی ان نظموں "مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ"،"حاضرین کانفرنس سے خطاب" اور"مسلمانوں کی تعلیم" حالی کے ان قطعات "سرسید احمد خاں کی تکفیر"،"سرسید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ" اور"سرسید احمد خاں کی تصانیف کی تردید" اوران کے ایک قصیدہ "قصیدۂ ناتمام (سرسید احمد خاں کی شان میں)" میں سرسید کی شخصیت،خدمات اورنظریات سے متعلق بہت سی معلومات ملتی ہیں جب کہ شبلی نے اپنی "مثنوی صبح امید" اوردیگر دو نظموں "جنگِ زرگری" اور "سرسیّد کی سیاسی بلاغت کا آمدوآورد" میں سرسید کی شخصیت،خدمات اورنظریات کا تعارف پیش کیا ہے۔حالی کی نظم "مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ" میں سرسید کے اس تاریخی

کارنامے کوخراج تحسین پیش کیا گیا ہے جس کوتاریخ میں دارالعلوم علی گڑھ کے نام سے یادکیا جاتا ہے۔حالی کے خیال میں سرسید نے دارالعلوم علی گڑھ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اورفلاح وکامرانی کے لیے قائم کیا تھا۔ان کی اس نظم ''مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ'' کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شوق سے اس نے بنایا مقبرہ اک شان دار
اور چھوڑا اس نے اک ایوانِ عالی یادگار
ایک نے دنیا کے پودے باغ میں اپنے لگائے
ایک نے چھوڑے دفینے سیم و زر کے بے شمار
اک محبِّ قوم نے اپنے مبارک ہاتھ سے
قوم کی تعلیم کی بنیاد ڈالی استوار
ہو گی عالم میں کہو سرسبز یہ پچھلی مراد
یا وہ اگلوں کی اُمیدیں لائیں گی کچھ برگ و بار(۶)

حالی نے اپنے ان اشعار میں سرسید کو 'محبِّ قوم' کالقب دیا ہے۔ان کے نزدیک سرسید نے ہندوستان میں دارالعلوم علی گڑھ کی بنیادرکھ کر مسلمان قوم میں جدید تعلیم کوفروغ دینے کے لیے راستے ہموارکردیے تھے۔حالی کی نظر میں سرسید اس وجہ سے قوم کے محسن اور مسیحا تھے کہ انھوں نے قوم کوجدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جدید تعلیم کے حصول پر زوردیا تھا۔حالی کوشاید اس بات کا احساس نہیں تھا کہ سرسید نے دارالعلوم علی گڑھ کے ذریعے مسلمانوں میں جس جدید مغربی طرزِ تعلیم کی داغ بیل ڈالی تھی،اس جدید طرزِ تعلیم نے ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کے لیے محکوم اور کلرک طبقے کی فراہمی نہایت آسان بنادی تھی۔ پھراس طرزِ تعلیم نے ہندوستانیوں میں یورپی تہذیب اورثقافت کوبھی فروغ دیا تھا۔

سرسید پرتنقید کرنے والوں کی نظر میں ایک طرف تو یہ جدید طرزِ تعلیم ہندوستان میں محض طبقۂ خواص کی تعلیم ہی کے لیے مخصوص تھا اور دوسری جانب عام مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی تھا۔یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ سرسید نے دارالعلوم علی گڑھ میں جس جدید طرزِ تعلیم کوعام رواج دیا تھا، وہ طرزِ تعلیم آج بھی ملک پاکستان میں جاری وساری ہے۔دورحاضر کے ناقدین کی نظر میں یہ طرزِ تعلیم ہی پاکستان کی تعلیمی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جدید علوم وفنون کی تعلیم اپنی زبانوں میں دیں تاکہ تعلیم کے ذریعے آسانی کے ساتھ تعلیم کے حصول کی راہ ہموار ہوسکے تاکہ طلبا تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملک وقوم کی ترقی میں اپنا کرداراداکرسکیں۔حالی نے سرسید کے قائم کردہ دارالعلوم علی گڑھ کو'قوم کا حاجت روا' بھی قراردیا تھا۔وہ اسی نظم ''مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ'' میں آگے چل کر کہتے ہیں:

آ رہی ہے اس مکاں کے گوشے گوشے سے صدا
قوم اگر سمجھے تو ہوں میں قوم کا حاجت روا
ہے کوئی اکسیر تو دنیا میں تو ہوں اکسیر میں
اور اصلِ کیمیا کچھ ہے، تو میں ہوں کیمیا(۷)

حالی کی نظر میں سرسید کا استوار کردہ دارالعلوم علی گڑھ مسلمان قوم کا سب سے بڑا حاجت روا ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کے لیے اکسیر اور اصل کیمیا کا درجہ بھی رکھتا تھا۔تاریخ گواہ ہے کہ سرسید کا قائم کردہ یہ دارالعلوم علی گڑھ مسلمان قوم کے لیے حاجت روائی ،اکسیری اور کیمیائی کا سبب کم ہی بنا تھا۔اس دارالعلوم نے مسلمان قوم کو دو دھڑوں میں تقسیم کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ان دھڑوں میں ایک دھڑا وہ تھا جو جدید طرزِ تعلیم کا حامی تھا اور مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے جانا پسند کرتا تھا جب کہ دوسرا دھڑا ایسے نظریات کا حامی تھا جن سے دارالعلوم علی گڑھ اور جدید طرزِ تعلیم کی مخالفت ٹپکتی تھی۔یہ طبقہ قدیم اسلامی طرزِ تعلیم کا حامی اور یورپی تہذیب سے دور بھاگنے والا تھا۔علاوہ ازیں دارالعلوم علی گڑھ میں اس زمانے کا طبقۂ خواص ہی تعلیم پاتا تھا۔اس ادارہ میں معاشرہ کے عام افراد کے لیے تعلیم حاصل کرنا ایک مشکل کام تھا کیوں کہ اس ادارے میں فیسیں اسلامی مدارس کی نسبت کافی زیادہ تھیں۔اس زمانے کے اسلامی مدارس میں آج کے اسلامی مدارس کی طرح مفت تعلیم دی جاتی تھی۔

ناقدین کے نزدیک دارالعلوم علی گڑھ کی فضا میں زیرِ تعلیم افراد علوم وفنون سے کم اور مغربی تہذیب سے زیادہ روشناس ہوئے تھے۔دارالعلوم علی گڑھ کے حوالے سے عام مسلمانوں میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ سرسید نے یہ دارالعلوم انگریزوں کے ایما پر قائم کیا ہے اور اس ادارہ کے قیام کا مقصد انگریزوں کے لیے محکوم اور کلرک طبقہ پیدا کرنا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول ''ابن الوقت'' میں کچھ ایسے ہی اشارے دیے ہیں اور چوٹیں کی ہیں۔ان کے نزدیک ایسے ادارہ کے قیام کا مقصد ہندوستانی معاشرہ میں بالعموم اور مسلمان قوم میں بالخصوص ابن الوقت جیسے افراد پیدا کرنا تھا جو انگریزی تعلیم کے چکر میں اپنے مذہب اور تہذیب کو بھی فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ حالی کے نزدیک یہ دارالعلوم ان تمام چوٹوں اور الزامات سے بری الذمہ قرار پاتا ہے۔ان کی نظر میں سرسید نے یہ ادارہ خالص مسلمان قوم کی تعلیم وترقی اور فلاح وبہبود کے لیے قائم کیا تھا۔انھوں نے ایسے ہی خیالات کا اظہار اپنی نظم ''مسلمانوں کی تعلیم'' میں بھی کیا تھا۔اس نظم ''مسلمانوں کی تعلیم'' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہمارے شکر سے اے قوم! احساں اس کا بالا ہے
کہ جس نے قوم کی تعلیم کا یاں ڈول ڈالا ہے
خدا کی برکت و رحمت ہو نازل تجھ پہ اے سیّد
کہ تُو نے بھائیوں کا ڈوبتا بیڑا سنبھالا ہے(۸)

حالی کی نظر میں سرسید نے مسلمان قوم کی تعلیم کے لیے دارالعلوم علی گڑھ کی صورت میں جو کارنامہ انجام دیا تھا، اس کارنامے کی وجہ سے مسلمان قوم کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے تھا۔ حالی کے نزدیک سرسید نے مسلمان قوم کے ڈوبتے بیڑے کو سنبھالا تھا۔ چناں چہ مسلمان قوم سرسید کے احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ حالی کی طرح شبلی نے بھی اپنی "مثنوی صبحِ امید" میں سرسید کے کردار اور ان کی کوششوں کو مسلمان قوم کے لیے ایک امید کی کرن قرار دیا تھا۔ شبلی کے نزدیک سرسید مسلمان قوم کو مایوسی، ناامیدی اور اداسی سے نجات دلانے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے مسلمان قوم کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ سرسید کا ہی کارنامہ تھا کہ مسلمان قوم میں درپیش مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ سرسید کی رہنمائی اور مسیحائی سے پہلے یہ قوم انتشار اور بزدلی کا شکار تھی۔ شبلی کی نظم "مثنوی صبحِ امید" کے یہ اشعار دیکھیے:

ماتم تھا یہ ہی کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جان کاہ
اس شان سے تھی وہ آہِ دل گیر — پہلو میں اثر بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی — جادو تھی؟ فسوں تھی؟ جانے کیا تھی؟
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں — نشتر سی اتر گئی جگر میں
جس سمت سے آئی تھی وہ آواز — وہ جلوہ نمائے سحر و اعجاز
جنبش جو ہوئی رگِ اثر کو — دل تھام کے سب بڑھے اُدھر کو
دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکین — آیا نظر اک پیر دیریں
صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پہ فروغِ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورتِ مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینچنے والا(۹)

شبلی کے خیال میں سرسید نے مسلمان قوم کی زبوں حالی کو دیکھ کر اس قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا تھا، انھوں نے سرسید کو 'ملک پر جان دینے والا' اور 'قوم کی ناؤ کو کھینچنے والا' مسیحا قرار دیا ہے۔ سرسید سے متعلق شبلی کے یہ خیالات تقریباً حالی کے خیالات سے ملتے جلتے ہی ہیں۔ حالی نے جس طرح اپنی نظم "مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ" میں سرسید اور دارالعلوم علی گڑھ کی علمی و تعلیمی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے، شبلی نے یہ کام اپنی "مثنوی صبحِ امید" کے ذریعے انجام دیا ہے۔ حالی و شبلی دونوں کے نزدیک سرسید کا قائم کردہ دارالعلوم علی گڑھ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ناگزیر ادارہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ شبلی کے نظریات میں وقت گزرنے کے ساتھ انقلابی تبدیلی آ گئی تھی اور وہ سرسید کے تعلیمی نظریات اور دارالعلوم علی گڑھ کی تعلیمی پالیسیوں

کے بڑے مخالف بن گئے تھے۔شبلی دارالعلوم علی گڑھ سے وابستگی کے ابتدائی زمانے میں سرسید اور دارالعلوم علی گڑھ کی تعلیمی خدمات اور پالیسیوں کے گُن گانے میں حالی سے کسی طور پیچھے نہیں تھے،جس کا ثبوت حالی کی نظم ''مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ''اور شبلی کی'' مثنوی صبحِ امید'' کے اشعار بھی ہیں۔شبلی کی ''مثنوی صبحِ امید'' کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ حاصلِ نالہائے شب گیر — یہ قوم کی آرزو کی تصویر
یہ اوجِ وہ خیالِ امید — یہ قوم کا نو نہالِ امید
صد شکر کہ آج بار ور ہے — جو شاخ ہے ، اس کی پر ثمر ہے
لایا ہے، وہ برگ و بار کیسا! — اعدا کو ہے خار خار کیسا!
بخت اُس کا جو آج اوج پر ہے — ہر لحظہ بہ رونق دگر ہے
یہ اُس کی ترقیوں کا ہے طور — کل اور تھا آج ہو گیا اور
پہلے سے یہ آب و تاب ہی آج — کل شمع تھا ، آفتاب ہے آج
اس چشمۂ فیض سے ہے سیراب — بنگال سے تا حدودِ پنجاب
دانشِ طلبانِ قوم اکثر — ہیں جمع ہر اک جگہ سے آ کر
کس نخل کے یاں ثمر نہیں ہیں — کس کان کے یاں گہر نہیں ہیں(۱۰)

شبلی کے یہ اشعار سرسید اور دارالعلوم علی گڑھ سے ان کی دلی عقیدت ومحبت اور وابستگی کا واضح ثبوت ہیں۔شبلی نے دارالعلوم علی گڑھ کو بنگال سے پنجاب تک کے مسلمانوں کے لیے چشمۂ فیض قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک دارالعلوم علی گڑھ میں ہندوستان بھر سے علم ودانش سے محبت کرنے والے طلبا جمع تھے۔سرسید نے جس زمانے میں دارالعلوم علی گڑھ کی بنیاد رکھی تھی،اس زمانے تک ہندوستان بھر میں ایسی نوعیت کا کوئی تعلیمی ادارہ مسلمان قوم کی رہنمائی کے لیے موجود نہ تھا۔شبلی کی نظر میں اس ادارہ کے قیام کے بعد ہندوستان کے طول وعرض سے مسلمان قوم کے چشم وچراغ یہاں تعلیم پانے آنے لگے تھے۔اگر ہندوستان کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں نظر آئے گی کہ اس دارالعلوم کے قیام سے پہلے مسلمان قوم میں مذہبی مدارس سے فیض یاب ہونے کا عام رجحان پایا جاتا تھا۔مسلمان دارالعلوم علی گڑھ جیسے اداروں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ان مذہبی مدارس میں دین ومذہب،زبان وادب اور فقہ وحدیث کی تعلیم دی جاتی تھی۔ان مدارس میں جدید مضامین کی تعلیم وتدریس کا بہت کم اہتمام ہوتا تھا۔مسلمانوں میں رائج یہ قدیم طرزِ تعلیم،جدید طرزِ تعلیم سے بہت مختلف تھا۔مسلمان قوم جدید طرزِ تعلیم سے بہت فاصلے رکھے ہوئے تھی۔حالی وشبلی کی نظر میں مسلمان قوم کو جدید طرزِ تعلیم سے روشناس کروانے میں سرسید نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اور سرسید کا قائم کردہ

دارالعلوم علی گڑھ اس کا نکتۂ آغاز تھا۔شبلی کی ''مثنوی صبحِ امید'' کے مذکورہ بالا اشعار اور حالی کی نظم ''حاضرین کانفرنس سے خطاب'' کے اشعار ایسے ہی خیالات کے ترجمان نظر آتے ہیں۔حالی اپنی نظم ''حاضرین کانفرنس سے خطاب'' میں فرماتے ہیں:

سیّد کو دو سہارا کہ غفلت سے قوم کی
اب تک پڑے ہیں کام بہت اس کے ناتمام
سر اپنے دھر لیا ہے اُسے ایک فرد نے
ہے یارو چھے کروڑ کے کرنے کا جو کہ کام(۱۱)

سرسید نے اس زمانے میں جو اہم کام اپنے سر دھر لیا تھا وہ ضروری کام اس وقت کے مسلمانوں کو جدید طرزِ تعلیم سے نہ صرف روشناس کروانا تھا بلکہ ان میں جدید طرزِ تعلیم کے مطابق علوم وفنون کے حصول کو فروغ بھی دینا تھا۔حالی نے اس میدان میں سرسید کو مسلمان قوم کا رہبر ورہنما تسلیم کیا ہے۔ان کے نزدیک جو کام چھ کروڑ مسلمانوں کے کرنے کے تھے،وہ سب کام سرسید نے تن تنہا انجام دیے تھے۔حالی اس نظم ''حاضرین کانفرنس سے خطاب'' کے اشعار میں اس بات کے آرزومند نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام مسلمان سرسید کے ناتمام کاموں میں ان کا ساتھ دیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کی مالی واخلاقی مدد بھی کریں۔حالی نے جہاں ایک طرف اپنی شاعری کے توسط سے مسلمان قوم کو سرسید کی مدد کا پیغام دیا تھا، وہاں دوسری طرف سرسید کے قومی کاموں میں ان کا خاطر خواہ ہاتھ بھی بٹایا تھا۔حالی نے مالی واخلاقی دونوں سطح پر سرسید کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔حالی کی طرح شبلی نے بھی سرسید کے قومی کاموں میں ان کی خوب مدد کی تھی۔حالی وشبلی ہندوستان بھر سے دارالعلوم علی گڑھ کے لیے مالی امداد جمع کرنے میں سرسید کے قافلے کے ہراول دستے کے سپاہی رہے تھے۔ انھوں نے سرسید کے ہمراہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا تھا اور دارالعلوم علی گڑھ کے لیے خاطر خواہ امداد جمع کروائی تھی۔سرسید وحالی وشبلی کے ریاست بھوپال، ریاست حیدرآباد دکن اور پنجاب کے مختلف دورے اس سلسلے کی مرکزی کڑیاں ہیں۔

حالی وشبلی اپنی اپنی شاعری میں سرسید کی بہت سی باتوں اور کاموں کا دفاع بھی کرتے نظر آتے ہیں۔سرسید کی شخصیت پر ان کی جدت پسند اور روشن خیال طبیعت کی وجہ سے کافی الزامات اور فتوے بھی لگے۔ان الزامات اور فتووں کا سب سے بڑا سبب ان کی انگریز نواز پالیسی تھی۔انھوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے دوران انگریز حکومت کا ساتھ دیا تھا اور ہندوستان والوں کے اس عمل کو تحریک آزادی کی بجائے غدر یعنی بغاوت کے نام سے تعبیر کیا تھا۔سرسید کی تصنیف ''رسالۂ اسباب بغاوت ہند'' ان کے اس عمل کا واضح ثبوت ہے۔انھوں نے ہندوستان کے تمام باشندوں کو بالعموم اور مسلمان قوم کو بالخصوص انگریزوں کا مطیع اور فرمانبردار رہنے کا درس

دیا تھا۔انھوں نے ہندوستان والوں کومغربی تہذیب وثقافت سے محبت کرنے کا سبق بھی پڑھایا تھا۔انھوں نے دارالعلوم علی گڑھ میں جدید مغربی طرزِ تعلیم کورواج دیا اورقدیم نظام تعلیم کوتنقید کانشانہ بنایا۔علاوہ ازیں انھوں نے مذہبی قرآنی تعلیمات کو لے کرنئی نئی تاویلات،تعبیرات اورتشریحات بھی پیش کیں۔یہ تمام وجوہات سرسید کی شخصیت پرالزامات اورفتوؤں کا سبب بنی تھیں۔سرسید کوان کے مندرجہ بالااقدامات کی وجہ سے وطن پرستوں اور مذہبی علمانے نیچری،کافراورملحد تک قراردیا تھا۔حالی وشبلی نے ان الزامات اورفتووں کے جواب میں سرسید کا بھرپوردفاع کیا جس کی وجہ سے حالی وشبلی کی ذات کوبھی ناقدین نے آڑے ہاتھوں لیااوران پربھی الزامات اور فتووں کی بوچھاڑکردی تھی۔حالی کے قطعات ''سرسیداحمدخاں کی تکفیر''اور''سرسیداحمدخاں کی مخالفت کی وجہ''میں ایسی ہی صورت حال کاذکرملتا ہے۔حالی کےاس قطعہ''سرسیداحمدخاں کی تکفیر''کے یہ اشعاردیکھیے:

مذہب منصور ہے لیکن بیاں کرنا ضرور
جو مسلّم آج کل نزدیک خاص و عام ہے
اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر
سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے(۱۲)

حالی نے ان مذہبی علماکوشدید طنزاورتنقید کانشانہ بنایا ہےجنھوں نے سرسید کی شخصیت پرکافراورملحد ہونے کےفتوے لگائے تھے۔اس زمانے میں سرسید کے مخالفین نے ان کے اچھے کاموں کوبھی بُری نظر سے دیکھنا اورغلط رنگ دیناشروع کردیا تھا۔حالی نے اپنے قطعات''سرسیداحمدخاں کی تکفیر''،''سرسیداحمدخاں کی مخالفت کی وجہ'' اور''سرسیداحمدخاں کی تصانیف کی تردید''میں ایسی ہی سرسید مخالف روش کوبےنقاب کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ انھوں نے سرسید کی شہرت اورناموری کوسرسید کی مخالفت کی سب بڑی اورحقیقی وجہ قراردیا ہے۔حالی کی نظر میں سرسید کے مخالفین ان کی شہرت،ناموری اورنیک نامی سے حسد کرنے لگے تھےجس کی وجہ سے وہ سرسید پرغلط الزامات اورفتوے لگانے لگے تھے۔لیکن سرسیداس قسم کےالزامات اورفتووں سےقطعی پریشان نہیں ہوتے تھے۔ حالی اپنے قطعہ''سرسیداحمدخاں کی مخالفت کی وجہ''میں بتاتے ہیں:

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ
کس لیے سیّد سے صاف اے حضرت والا نہیں
کافر و ملحد ہمیشہ اس کو ٹھہراتے ہیں آپ
ثابت اسلام اس کا نزدیک آپ کے گویا نہیں(۱۳)

حالی نے اپنے اس قطعہ''سرسیداحمدخاں کی مخالفت کی وجہ''میں پہلےسرسید کےایک منکر سے سوال کیا ہے کہ ان کی طرف سے سرسید کی مخالفت کااصل سبب کیا ہےاورانھیں کافراورملحد کیوں ٹھہراتے ہیں؟ حالی نے پھر

اسی قطعہ ''سرسید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ'' میں آگے چل کر خود ہی منکر کی جانب سے اس سوال کا جواب بھی دے دیا ہے۔ جواب پر مبنی اشعار دیکھیے:

سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے
بات یہ ہے ، سن لو صاحب ، تم سے کچھ پردا نہیں
رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں(۱۴)

جواب پر مبنی ان اشعار میں حالی نے مخالفین کی جانب سے سرسید کی منکری کا اصل سبب شہرت اور ناموری میں ان جیسا نہ ہو سکنے کو بتایا ہے۔ سرسید نے انگریز مصنف ولیم میور کی ایک کتاب کے جواب میں ''خطبات احمدیہ'' کے عنوان سے اپنی کتاب لکھی تھی، ولیم میور نے اپنی کتاب میں نبی ﷺ کی شخصیت و نبوت پر الزامات عائد کیے تھے اور سرسید نے ''خطبات احمدیہ'' میں ان الزامات کا رد لکھا تھا۔ اس زمانے میں چند مذہبی علما اور مخالفین نے سرسید کی اس کاوش کو بھی شک کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ ان مذہبی علما اور مخالفین نے سرسید کی کتاب ''خطبات احمدیہ'' کا رد بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ حالی نے اپنے اس قطعہ ''سرسید احمد خاں کی تصانیف کی تردید'' میں ان ہی مذہبی علما کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ حالی نے ایک قصیدہ بھی سرسید کی شان میں لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ قصیدہ نامکمل رہ گیا تھا۔ حالی نے اپنے اس نامکمل قصیدہ میں بھی سرسید کی قومی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ حالی کا یہ نامکمل قصیدہ ان کی جانب سے سرسید کی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس ''قصیدۂ ناتمام (سرسید احمد خاں کی شان میں)'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اس دور آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمھارا مصلح کھڑا کیا ہے
سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کی گو کافر ٹھہر چکا ہے
وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے
وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے
قوم اس سے بد گماں ہے وہ قوم پر فدا ہے
درہم سے اور قلم سے ، دم سے قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اُس نے وہ کس سے ہو سکا ہے

ہمدرد قوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا
یہ درد اس کو جد کی میراث میں ملا ہے
تعلیم کی تمھاری بنیاد اس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے
بعد از قرون اولیٰ کس نے کیا بتاؤ
سید نے کام آ کر جو قوم میں کیا ہے(۱۵)

حالی نے اپنے ان اشعار میں سرسید کو ایک سید زادہ بتایا ہے۔ان کی نظر میں سرسید سے بڑھ کر کوئی بھی قوم کا حقیقی ہمدرد اور خیر خواہ نہیں تھا۔ان کی نظر میں سرسید نے مسلمان قوم کو جدید تعلیم کی طرف لانے میں اہم کردار ادا کیا۔سرسید پر مسلمان قوم کی خدمت کے صلے میں کفر کے فتوے لگے لیکن انھوں نے مسلمان قوم کی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا۔حالی کا یہ نامکمل قصیدہ سرسید سے ان کی محبت وعقیدت کا بھی شاہد اور گواہ ہے۔حالی کی طرح شبلی نے بھی اپنی اردو شاعری میں سرسید کی شخصیت پر لگائے جانے والے الزامات کا بھرپور دفاع کیا ہے۔شبلی ''مثنوی صبحِ امید'' میں پہلے سرسید پر لگائے جانے والے الزامات کا ذکر کرتے ہیں اور پھر خود ہی ان الزامات کا جواب بھی دیتے ہیں۔ان کی نظم ''مثنوی صبحِ امید'' کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کیا تلخ ملے جواب اُس کو! کیا کیا نہ دیے خطاب اُس کو!
برگشتہ کہا کسی نے دین سے! لعنت کا صلہ ملا کہیں سے
خود قوم کو ہو گئی تھی یہ کہ زندیق کہا کسی نے مرتد!
چرچے تھی یہی ز غرب تا شرق وہ اپنی ہی دھن میں تھا مگر غرق
گو ناوکِ ظلم کا ہدف تھا وہ شیفتہ پھر بھی سر بہ کف تھا
منظور جو قوم کا تھا اعزاز ذلت پہ بھی اپنی تھا اسے ناز
دشنام کو وہ دعا ہی سمجھا! وہ درد کو بھی دوا ہی سمجھا
جور اس نے سہے کرم کے بدلے! لطف اُس نے کیے ستم کے بدلے!
ہر چند یہ مشکلیں تھیں درپیش گو غیر تھے سب یگانہ و خویش
دل کو نہ رہا تھا آسرا بھی یاروں میں وفا نہ تھی ذرا بھی
بیگانہ عزیز خویش ٹھہرا سمجھا جسے نوش نیش ٹھہرا(۱۶)

شبلی نے مثنوی ''صبحِ امید'' کے ان اشعار میں مذہبی علما اور عوام الناس کی جانب سے سرسید کو دی جانے والی گالیوں اور دشنام طرازیوں کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے قوم پر سرسید کے احسانات اور کرم نوازیاں بھی

یاد دلائی ہیں۔شبلی نے سرسید کو برگشتہ، کافر اور مرتد قرار دینے کو بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔شبلی نے سرسید کی اس بات اور عمل کو بھی سراہا ہے کہ انھوں نے مخالفین کی غلط باتوں کی پرواہ کیے بغیر قوم کی ترقی وخوشحالی کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھی تھیں۔انھوں نے مذہبی علما اور قوم کی ستم طرازیوں کو بھی برداشت کیا اور جواب میں رحم وکرم کی پالیسی کو جاری رکھا۔شبلی نے اپنے ان اشعار میں مشکل وقت میں دوستوں اور احباب کی جانب سے سرسید کا ساتھ چھوڑنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ان کی نظر میں سرسید ان حالات میں بھی گھبرائے نہیں تھے بلکہ انھوں نے ہمت اور حوصلے کے ساتھ ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔حالی کی طرح شبلی نے بھی سرسید کی مخالفت کا اصل سبب مخالفین کے دل میں موجود بغض، حسد اور عناد کو قرار دیا ہے۔شبلی کی نظم ''مثنوی صبحِ امید'' کے یہ اشعار دیکھیے:

سیّد سے اگر ہے بغض للہ　　وہ خادم قوم اگر ہے گمراہ
کچھ آپ ہی انتظام کرتے　　اسلام کو نیک نام کرتے
باتیں فقط نہ بنا کے رہتے　　جو منہ سے کہا دکھا کے رہتے
اسلام کی دوستی تو یہ تھی　　الفت کی دلیل تھی تو یہ تھی (۱۷)

شبلی ایسے نام نہاد مذہبی علما کو چیلنج کرتے نظر آتے ہیں جن کا وطیرہ اور عادت صرف باتیں بنانا ہے، جن میں عملی طور پر قوم کے لیے کچھ کر گزرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔شبلی کی نظر میں ایسے مذہبی علما دین ودنیا کی خدمت سے بھی کوسوں دور ہوتے ہیں۔شبلی نے سرسید کو مسلمان قوم کا حقیقی خادم قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک سرسید قول وفعل کے پکے، کھرے اور سچے انسان تھے۔وہ جو کچھ کہتے تھے، وہ عملی طور پر کر کے بھی دکھاتے تھے جب کہ سرسید کے علاوہ دوسرے مذہبی علما میں قول وفعل کا تضاد پایا جاتا تھا۔وہ علما جو کچھ کہتے تھے، عملی طور پر کر کے دکھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

حالی اپنی پوری زندگی سرسید نوازی کا دم بھرتے رہے۔مگر شبلی سرسید نوازی میں، حالی کے مقابلے میں کافی مختلف انسان نکلے۔انھوں نے اپنی زندگی کے ایک موڑ پر سرسید نوازی سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔شبلی نے جہاں اپنی زندگی میں ایک طرف سرسید کے تعلیمی کاموں میں دارالعلوم علی گڑھ کی سطح پر ان کا ہاتھ بٹایا تھا، وہاں دوسری طرف انھوں نے اپنی زندگی کے ایک خاص موڑ پر سرسید کی تعلیمی پالیسیوں، مذہبی تاویلات وتشریحات اور سیاسی نکتۂ نظر کی مخالفت بھی شروع کر دی تھی۔یہ شبلی کا ایک نیا روپ اور انوکھا انداز تھا، جس کی چند مثالیں ان کی اردو شاعری میں بھی ملتی ہیں۔ان کی اردو شاعری میں سرسید کے تعلیمی وسیاسی نظریات سے متعلق کچھ ایسے خیالات ملتے ہیں جن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی دارالعلوم علی گڑھ سے وابستگی کے ابتدائی زمانے میں تو سرسید کے تعلیمی اور سیاسی نظریات سے کافی مطمئن اور متفق رہے۔لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا شبلی، سرسید کے تعلیمی اور سیاسی نظریات سے کافی دور ہوتے چلے گئے۔شبلی نے دارالعلوم ندوۃ العلما کے قیام میں جو کردار ادا کیا، ان

کا وہ کردار بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔بعض ناقدین نے شبلی کے اسی کردار کے سبب دارالعلوم ندوۃ العلما کو دارالعلوم علی گڑھ کا ردِعمل قرار دیا ہے۔سرسید،شبلی،دارالعلوم علی گڑھ اور دارالعلوم ندوۃ العلما سے متعلق اس قسم کی آوازیں سرسید وشبلی کی زندگی ہی میں اُٹھنے لگی تھیں۔یہ آوازیں سرسید وشبلی کی سماعتوں تک بھی پہنچی تھیں جس کا اندازہ شبلی کی نظم ''جنگِ زرگری'' کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

کیا لطف ہے کہ حامیِ ندوہ ہیں اب وہ لوگ — جن کو کہ اس کے نام سے بھی اجتناب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوہ غریب — اک بے ہودہ خیال تھا،یا آں کہ خواب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں تعلیم کا یہ طرز — اعلانِ جنگ '' سیّد ''عالی جناب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوہ حقیر — تعلیم مغربی کے لیے سدِ باب تھا
ندوہ کا نام سن کے جو کھاتے تھے پیچ وتاب — جنکے لیے وہ موجبِ رنج وعذاب تھا(۱۸)

سرسید نے دارالعلوم علی گڑھ میں جدید مغربی طرزِ تعلیم کو عام رواج دیا تھا۔شبلی اوران کے ساتھیوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما میں قدیم وجدید اسلامی طرزِ تعلیم کے امتزاج سے ایک نئے طرزِ تعلیم کو رواج دینے کی کوشش کی تھی۔سرسید سمجھتے تھے کہ ہندوستان والوں کی ترقی وخوشحالی کا دارومدار جدید مغربی طرزِ تعلیم کے مطابق تعلیم حاصل کرنے میں ہے جب کہ شبلی کا خیال یہ تھا کہ کوئی قوم بھی اپنی قدیم روایات واقدار سے قطع تعلق کر کے ترقی وخوشحالی کی منازل طے نہیں کر سکتی ہے۔یعنی سرسید صرف جدید تعلیم اور شبلی قدیم وجدید دونوں طرح کی تعلیم کے حامی تھے۔البتہ شبلی انگریزی زبان سیکھنے کے بہت حامی تھے اور انھوں نے مسلمان علما کو بھی انگریزی تعلیم سیکھنے کی تلقین فرمائی تھی۔شبلی نے دارالعلوم ندوۃ العلما کے نصاب میں انگریزی زبان کی تعلیم کو شامل کروانے میں کلیدی کردار بھی ادا کیا۔شبلی جدید تعلیم کے مخالف نہیں تھے لیکن وہ قدیم تعلیم کو مکمل طور پر چھوڑ دینے کے حامی بھی نہیں تھے۔

شبلی کی نظر میں سرسید کے سیاسی نظریات بھی ان کے اپنے نہیں تھے بلکہ انھوں نے یہ سیاسی نظریات مغرب کے سیاسی نظریات سے مستعار لیے تھے۔شبلی کے نزدیک سرسید کے سیاسی نظریات میں آمد کے بجائے آورد کی کیفیت تھی۔شبلی نے اپنی نظم ''سرسیّد کی سیاسی بلاغت کا آمدوآورد'' کے اشعار میں کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے:

کوئی پوچھے تو کہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات — روشِ سیّد مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریکِ سیاسی کے خلاف — ان کی جو بات تھی آورد تھی،آمد تو نہ تھی (۱۹)

شبلی کی نظموں ''جنگِ زرگری'' اور ''سرسیّد کی سیاسی بلاغت کا آمدوآورد'' کے خیالات ان کی نظم ''مثنوی صبحِ امید'' کے خیالات سے بالکل مختلف دکھائی دیتے ہیں۔شبلی نے ''مثنوی صبحِ امید'' میں سرسید کے تعلیمی

اور سیاسی نظریات سے اتفاق کیا تھا اور ان دونوں نظموں ''جنگِ زرگری'' اور ''سرسیّد کی سیاسی بلاغت کا آمد و آورد'' میں ان نظریات سے عدم اتفاق کر دیا تھا۔ جس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ شبلی نے سرسید اور دارالعلوم علی گڑھ سے وابستگی کے ابتدائی زمانے میں لکھی جانے والی اپنی نظم ''مثنوی صبحِ امید'' میں سرسید کی ایک تصویر پیش کی تھی اور اس کے بعد کے زمانے میں لکھی جانے والی نظموں ''جنگِ زرگری'' اور ''سرسیّد کی سیاسی بلاغت کا آمد و آورد'' میں سرسید کی ایک دوسری تصویر پیش کی تھی۔ یعنی سرسید سے متعلق شبلی کے پہلے اور بعد کے خیالات میں تضاد تھا جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دارالعلوم علی گڑھ میں سرسید کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد شبلی کے خیالات میں کافی بدلاؤ آیا تھا۔ شبلی جو ایک وقت میں سرسید کے کاموں کے قصیدہ گو تھے، اب ان کے کاموں کے مخالف لگنے لگے تھے۔ شبلی کے خیالات میں اس تبدیلی و تضاد کے حوالے سے عبدالرزاق کانپوری لکھتے ہیں:

> ''مدرسۃ العلوم کی پروفیسری کے بعد سب سے پہلی نظم مثنوی ''صبح امید'' ہے جس میں سرسید کی خدمات اور برکات کا ذکر ہے، جس سے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی لیکن غالباً یہ نظم مجبوراً لکھی گئی۔ کیوں کہ مثنوی کے مضامین مولانا کی خوددار طبیعت کے خلاف ہیں۔''(۲۰)

عبدالرزاق کانپوری نے ''مثنوی صبحِ امید'' میں سرسید کی مسیحائی، خدمات اور برکات سے متعلق شبلی کے جن خیالات کو ان کی مجبوری کا نام دیا ہے اور اس مثنوی کے مضامین کو شبلی کی خوددار طبیعت کے خلاف قرار دیا ہے، یہ خیالات کسی طرح بھی حقیقت کے قریب تر معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ ہاں اگر عبدالرزاق کانپوری یہ بات کرتے کہ دارالعلوم علی گڑھ کی فضا میں وقت گزرنے کے ساتھ شبلی کو سرسید کی شخصیت اور نظریات کا درست ادراک ہوا تھا اور پھر اس ادراک کے بعد وہ سرسید کے متعلق اپنے سابقہ خیالات سے دست بردار ہو گئے تھے، تو ان کے یہ خیالات حقیقت کے زیادہ قریب ثابت ہو سکتے تھے۔ عبدالرزاق کانپوری نے ''مثنوی صبحِ امید'' کی تخلیق کو شبلی کی مجبوری قرار دے کر شبلی کو معصوم ثابت کرنے کی جو شعوری کوشش کی ہے، وہ کسی طرح بھی حقیقت کے قریب معلوم نہیں ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی ''مثنوی صبحِ امید'' کی تخلیق کے زمانے میں سرسید کے تعلیمی و سیاسی نظریات سے بالکل متفق تھے۔ شبلی اور سرسید میں اختلافات کا باقاعدہ آغاز سرسید کی طرف سے کی جانے والی مذہبی و قرآنی تاویلات و تشریحات کے بعد ہوا تھا۔ شبلی، اس اختلاف کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

> ''زمانہ جانتا ہے کہ مجھکو سرسیّد کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا، اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا، تاہم اس سے مجھکو کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو زبان مین ادا کیا ہے کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا۔''(۲۱)

شبلی نے سرسید سے اپنے مذہبی اختلافات کا صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ سرسید و شبلی کے درمیان مذہبی مسائل کے حوالے سے جو سخت اختلاف تھا وہی سرسید و شبلی کے مابین اختلافات کا نکتۂ آغاز تھا۔

اسی اختلاف کے بعد سرسید وشبلی میں تعلیمی اور سیاسی سطح پر اختلافات کا آغاز ہوا۔شبلی نے تعلیمی سطح پر اختلافات کا اظہار دارالعلوم علی گڑھ سے علیحدگی اور دارالعلوم ندوۃ العلما سے وابستگی کے ذریعے کیا جب کہ سیاسی سطح پر اختلافات کا اظہار آل انڈیا کانگرس سے وابستہ ہو کر کیا۔سرسید نے مسلمان قوم کو آل انڈیا کانگرس سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا لیکن شبلی نے سرسید کی اس بات کو ایک طرف رکھ کر آل انڈیا کانگرس میں شمولیت اختیار کرنا پسند کیا۔شبلی ''مثنوی صبحِ امید'' میں سرسید کے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی نظریات کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں اور بعد کی نظموں میں اسی شخص کے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی نظریات سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''شبلی کو صرف مذہبی ہی نہیں، تعلیمی اور سیاسی معاملات میں بھی اختلاف تھا۔شبلی سمجھتے تھے کہ جدید تعلیم سے مسلمان مذہب سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں اور ان کا یہ خیال غلط بھی نہیں تھا۔لیکن شبلی اور سرسید میں ایسے اختلافات تھے، جو دو عالموں میں ہوتے ہیں۔''(۲۲)

ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ رائے حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔سرسید وشبلی کے خیالات میں اختلاف مذہبی، تعلیمی اور سیاسی تینوں سطحوں پر نمایاں تھا۔سرسید وحالی کے خیالات میں مذہبی، تعلیمی اور سیاسی سطحوں پر کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔حالی مذہبی، تعلیمی اور سیاسی خیالات میں سرسید کے پیروکار نظر آتے ہیں۔انھوں نے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی میدانوں میں کسی بھی حوالے سے سرسید کے نظریات سے انحراف کرنے کی جرات نہیں کی تھی۔یہ شبلی ہی تھے جنھوں نے سرسید کے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی نظریات سے اختلاف کی جرات کی تھی۔شبلی مذہب، تعلیم اور سیاست سے متعلق اپنے نظریات رکھتے تھے۔حالی مذہب، تعلیم اور سیاست میں سرسید کے نظریات کے تابع تھے۔حالی وشبلی کی اردو شاعری میں بھی سرسید سے متعلق جو خیالات ملتے ہیں، ان سے بھی یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی نے سرسید کے نظریات سے مکمل اتفاق کیا ہے۔لیکن شبلی نے سرسید کے نظریات سے اتفاق کرنے کے ساتھ ساتھ اختلاف بھی کیا تھا۔حالی وشبلی کی اردو شاعری کی روشنی میں سرسید کے مقام کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شبلی کے مقابلے میں حالی کی نظر میں سرسید کا مقام ومرتبہ کہیں زیادہ بلند ہے۔حالی اپنی اردو شاعری میں سرسید کی ذات کو بغیر کسی شک وشبہ کے مسلمان قوم کا حقیقی ہیرو اور محسن قرار دیتے ہیں۔لیکن شبلی کی اردو شاعری میں سرسید کو قوم کا محسن اور ہیرو ماننے کے حوالے سے شک وشبہ کا اظہار دیکھا جا سکتا ہے۔حالی کی نظر میں سرسید کی مذہبی، سیاسی اور تعلیمی خدمات اختلاف سے بالاتر تھیں۔لیکن شبلی نے سرسید کے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی نظریات سے اختلاف کیا تھا۔شبلی، حالی کی طرح سرسید کے مرید نہیں تھے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) افضل حق قرشی، حیاتِ حالی ماہ و سال کے آئینے میں، مضمون مشمولہ، صحیفہ، حالی نمبر (لاہور)، مدیر، افضل حق قرشی و تحسین فراقی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲

(۲) سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۴۳ء، ص ۱۱۷

(۳) حالی، مولانا الطاف حسین، ترجمۂ حالی، مشمولہ، کلیاتِ نظم حالی، جلد اول، مرتبہ، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، طبع اول ۱۹۶۸ء، ص ۱۲

(۴) ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، عظمت کے نشاں، اعظم گڑھ: ادب کدہ، با راول، ۲۰۰۵ء، ص ۳۷

(۵) عبداللطیف اعظمی، مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، دہلی: شبلی اکادمی، ۱۹۴۵ء، ص ۳۳

(۶) حالی، مولانا خواجہ الطاف حسین، کلیاتِ نظم حالی، جلد دوم، مرتبہ، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، طبع اول ۱۹۷۰ء، ص ۲۰۰

(۷) حالی، مولانا خواجہ الطاف حسین، کلیاتِ نظم حالی، جلد دوم، ص ۲۰۱

(۸) ایضاً، ص ۲۲۰

(۹) شبلی نعمانی، مولانا، کلیات شبلی (اردو)، مرتبہ، سید سلیمان ندوی، اعظم گڈھ: معارف پریس، س۔ن، ص ۷۔ ان اشعار کو جدید شعری اسلوب سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

(۱۰) ایضاً، ص ۱۹

(۱۱) حالی، مولانا خواجہ الطاف حسین، کلیاتِ نظم حالی، جلد دوم، ص ۲۴۷

(۱۲) ایضاً، کلیاتِ نظم حالی، جلد اول، ص ۱۹۶ (۱۳) ایضاً، ص ۱۹۸

(۱۴) ایضاً، ص ۱۹۸ (۱۵) ایضاً، ص ۲۶۹

(۱۶) شبلی نعمانی، مولانا، کلیات شبلی (اردو)، ص ۱۶۔ ان اشعار کو جدید شعری اسلوب سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

(۱۷) ایضاً، ص ۲۱ (۱۸) ایضاً، ص ۱۰۳ (۱۹) ایضاً، ص ۱۱۱

(۲۰) عبدالرزاق کان پوری، شمس العلماء پروفیسر شبلی نعمانی، مضمون مشمولہ، صحیفہ، شبلی نمبر (لاہور)، مدیر، افضل حق قرشی و تحسین فراقی، ۲۰۱۴ء، ص ۶۸۱

(۲۱) شبلی نعمانی، مولانا، سرسیّد مرحوم اور اردو لٹریچر، مضمون مشمولہ، مقالاتِ شبلی، جلد دوم (ادبی)، در مطبع معارف: اعظم گڈھ، طبع دوم، ۱۹۵۰ء، ص ۶۴

(۲۲) خلیق انجم، ڈاکٹر، شبلی کی علمی و ادبی خدمات، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۶ء، ص ۳۱۰